قرآن فہمی

اورنگ زیب یوسفزئی

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں　　خدا کرے تجھ کو عطاء جدت کردار

عزیزم شیخ طیب معاویہ نے قصور سے مندرجہ بالا عنوان پر مضمون لکھنے کی فرمائیش کی تو اس احقر نے اپنے تئیں ایک بڑی مشکل میں گرفتار پایا، اور بہت سے شب و روز اسی تفکر میں رائیگاں گئے کہ اس فرمائیش کی تکمیل کے لئے شروعات کہاں سے کی جائے۔ اقبال کا یہ اعلان بار بار بیش نظر آتا رہا کہ:

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں　　ہے وہی سرمایہ داری بندہء مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　بے یدبیضاء ہے پیران حرم کی آستیں

اقبال کے مندرجہ بالا فرمان کی روشنی میں بات بالکل واضح ہے کہ علوم دینیہ کے ضمن میں قرآن سمجھنے کا عنصر ہمارے دینی حلقہ ہائے تدریس میں صدیوں سے مفقود ہے۔ ہم قرآن کو صرف پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ یا پھر زبانی رٹے لگانے کے لئے یاد [حفظ] کر لیتے ہیں۔

کسی بھی دینی مدرسے کے سائن بورڈز پر نظر ڈال لیجیئے۔ آپ کو حفظ و ناظرہ اور تجوید کے الفاظ ہی نظر آئیں گے۔ تفہیم کہیں غلطی سے بھی لکھا نظر نہیں آئیگا۔ دینی مدرسوں کے نصاب میں قرآنی تفہیم کا عنصر مجرمانہ انداز میں غائب ہی ملیگا۔ اب جس معاشرے میں غالب اکثریت قرآن کو سمجھنے میں یقین ہی نہ رکھتی ہو، وہاں قرآن سمجھنے کی ضرورت کا راگ الاپنا بند کمرے میں دیواروں سے سر ٹکرانے کے مترادف ہی ہو گا۔ جہاں قرآن کو صرف پڑھ لینا ہی بے حساب ثواب کا موجب قرار دے دیا گیا ہو، اور اگر پڑھنے کی استعداد نہ ہو تو اس کی سطروں پر انگلی پھیر دینا ہی مغفرت کا حقدار بنادے، تو کون بے وقوف سمجھنے اور سمجھانے کی " فضول مشق "

میں وقت ضائع کرے۔ جہاں حصول مقصد صرف پہلی آسان منزل پر پہنچ کر ہی پورا ہو جاتا ہو، وہاں طول طویل سفر کی خارہ شگافی کون مول لے۔

"اور بھی غم ھیں زمانے میں محبت کے سوا"۔۔۔۔

ہمارے معاشرے میں قرآن سمجھنے کی ضرورت کا ادراک ہی موجود نہیں۔ اس کا بنیادی سبب قرآن کے الہامی وثیقے کے متوازی دوسری کتابوں کا وجود ھے جنہیں قرآن پر حاوی Super impose کر دیا گیا ہے۔ جواز اس کا یہ دیا جاتا ہے کہ ان کتابوں کے بغیر قرآن سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب لیا جانا کہ قرآن کی تفہیم کو خارج از نصاب قرار دے کر یکسر نظر انداز کر دیا جائے اور دین صرف انہی کتابوں سے ہی سمجھا جائے، بعید از عقل اور قرآن کے ساتھ زیادتی ہے۔ ان کتابوں سے مدد لینا اگر ضروری محسوس ہو تو مدد ضرور لے لی جائے، لیکن مرکز نگاہ یعنی قبلہ تو وہی اللہ جل شانہ کی کتاب یعنی قرآن ہی رہنا چاہیئے۔ جب کہ وہ کتاب خود پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ وہ:

و نزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیئی [۱۶/۸۹]

ہم نے تجھ پر وہ کتاب نازل کی ہے جو ہر معاملے کو [جو بھی اس میں ہے] کھول کر وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔

کل شیئی فصلناہ تفصیلا [۱۷/۱۲]

ہم نے ہر معاملے کی تفصیل کھول کر بیان کر دی ہے

و لا رطب و لا یابس الا فی کتاب مبین [۶/۵۹]

کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو کتاب میں بیان نہ کر دیا گیا ہو۔

و ما فرطنا فی الکتاب من شیئ [۶/۳۸]

اور الکتاب میں ہم نے کوئی چیز بھی نظر انداز نہیں کی۔

کتاب احکمت آیاته ثم فصلت من لدن حکیم خبیر [۱۱/۱]

ایک ایسی کتاب جس کی آیات مستحکم کر دی گئی ہیں پھر اس حکمت والے اور باخبر کی طرف سے کھول کر سمجھادی گئی ہیں۔

اور بہت سی آیات اس ضمن میں حوالہ زد کی جاسکتی ہیں مگر طوالت کا موجب ٹھریں گی۔

پاکستان میں دینی مدرسوں کی اصل تعداد پچاس ہزار سے زائد ہے۔ ۲۰۰۱ کی شماریات کے مطابق [ریسرچ پی۔ ڈبلیو سنگر / بروکنگز انسٹی ٹیوٹ، ریاست ہائے متحدہ] یہ تعداد پینتالیس ہزار تھی۔ لیکن اپریل ۲۰۰۲ میں وفاقی وزیر محمود احمد غازی نے معاملے کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے صریحا دروغ بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ تعداد صرف ۱۰،۰۰۰ اور ان میں زیر تعلیم طلباء کی تعداد ۱۷،۰۰،۰۰۰ [سترہ لاکھ] بتائی تھی۔ اصل تعداد اگر صرف ۵۰،۰۰۰ ہی لے لی جائے [جو کہ ۲۰۰۱ کی شماریات کے مطابق ہے] توزیر تعلیم طلباء کی تعداد ۸۵،۰۰،۰۰۰ [پچاسی لاکھ] ہو جاتی ہے۔ یہ ۸۵ لاکھ سے زائد وہ طالبعلم ہیں جنہوں نے مستقبل قریب میں اس ملک کی مذہبی قیادت سنبھالنی ہے۔ انتہائی افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ سب کے سب قرآن کے رٹے تو لگا سکتے ہیں لیکن اس کی اساسی تعلیمات اور اس کے مجموعی پیغام سے نابلد ہیں کیونکہ قرآن کی تفہیم ان کے نصاب میں ہی شامل نہیں۔ بلا شک و شبہ ہمارا وہی حال ہے جو اس جہاز کے مسافروں کا ہونا چاہیئے جس کے ناخداءوں کے سامنے کوئی متعین سمت ہی نہ ہو اور وہ بحر ظلمات میں لامتناہی طور پر بھٹکتا پھرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زمین پر موجود حقائق ہماری اس بے سمتی کو جاننے کے لئے کافی ہیں۔ صرف ایک نگاہ بصیرت کی ضرورت ہے جو ایک لمحے میں حقیقت حال واضح کر سکتی ہے۔

قرآن در حقیقت، تمام مروج تصورات کے برعکس، ایک حقوق انسانی کی کتاب ہے۔ ظلم و ستم، استحصال اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے کا منشور ہے، جیسا کہ اس آیت مبارکہ سے ثابت ہے جس میں نبی اکرم کی بعثت کا مقصد اسطرح بتایا گیا ہے کہ:

ویضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم [۷/۱۵۷]

وہ ان پر سے ظلم و تشدد کا بوجھ اور غلامی کے طوق اتارنے تشریف لائے تھے۔

پس قرآن کی تفہیم کا فقدان آج تک ہمیں طاقتور اور بے رحم حکمرانوں اور ظالم سرمایہ داروں کا مشق ستم بناتا چلا آ رہا ہے۔ تاریخ کا گہرا مطالعہ اور بے لاگ تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ خلفائے راشدین کے سنہری دور کے فوراً بعد قریش کے پرانے بے رحم ظالم حکمرانوں [بنو امیہ] نے مسلم سلطنت کی عنان حکومت سنبھال لی اور تلوار کے زور پر از سر نو جبر، استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی حکمرانی شروع کر دی۔ یہی وہ دور تھا جب قرآن کے حقیقی معانی کو چھپانے اور مسخ کرنے کی حکومتی سطح پر منظم کوششیں شروع ہو گئیں۔ یہ نکتہ سمجھنے کے لئے کسی کو بقراط ہونے کی ضرورت نہیں کہ بدقماش ڈکٹیٹر شپ اور موروثی حکمرانی کے دوام کے لئے رسول اللہ اور صحابہ خلفائے راشدین کی خدائی حکومت کے خدوخال نیست و نابود کرنا اولین ترجیح قرار پاتی ہے۔ یہ خدوخال قرآن نے مہیا کئے تھے۔ اس لئے قرآن دشمنی کی ابتداء اولین دور بنو امیہ سے ہی عمل پزیر ہو گئی تھی۔ پہلی تحریف شدہ اور جعلی تفسیر کے لئے یہودی عالم محمد بن السائب کلبی [المتوفی ۱۴۶ھ] کی خدمات حاصل کی گئیں جو تفسیر ابن عباس کا واضع ہے، یہودی النسل ہے اور حضرت ابن عباس سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا۔

مآل کار، کتب احادیث کی تدوین کے بعد، قرآن کی تفہیم کو کار عبث ہی قرار دے دیا گیا اور یہ بات عقیدے کے طور پر پھیلا دی گئی کہ اس کا صرف پڑھ لینا ہی مغفرت کے لئے کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ علمائے کرام کو برین واش کر کے اسی لائن پر لگا دیا گیا۔ عربوں میں مذہبی قیادت ہمیشہ حکمرانی کے براہ راست ماتحت رہی ہے اور علماء و ائمہ مساجد سرکاری تنخواہ دار۔ اس صورت

حال میں قرآن کی حقیقی شبیہ، اس کا مقام اور اس کا پیغام عوام تک کون پہنچاتا۔ قرآن کا نور کون پھیلنے دیتا۔ اور اگر قرآن کا نور ظلمت کے پردوں میں چھپا نہ دیا جاتا، تو مال وزر کے انبار کیسے جمع کیے جاسکتے، پر تعیش محلات کیسے تعمیر ہو سکتے، حرم سراءیں کیسے آباد ہوتیں، لونڈی غلاموں کی تجارت کیسے پھلتی پھولتی اور غریب طبقات کا استحصال کیسے جاری رہ سکتا تھا۔

اولین چالیس سال کی عطا کردہ، دین الٰہی کی میراث، اتنی عظیم تھی کہ اس کے اثرات مطلق العنان موروثی بادشاہتوں کے باوجود تقریباً ۳۰۰ سال تک غلبے، حکمرانی اور علوم وفنون کے فروغ پر منتج ہوئے۔ اس کے بعد حکومتی شیرازہ بکھر گیا۔ مرکزیت ختم ہوئی۔ خلفاء طاقتور امراء کے دست نگر ہو گئے اور طوائف الملوکی کا دور آ پہنچا۔ پھر وسط ایشیاء سے لائے گئے ترکوں، پھر دیلمیوں، سلجوقوں، ممالیک اور بعد ازاں عثمانیوں کے مابین یکے بعد دیگرے اقتدار کی رسہ کشی کی طویل داستان شروع ہوئی جو ۱۸ویں صدی عیسوی کے اواخر اور انیسوں صدی کے اوائل اور وسط میں انگریزی نو آبادیاتی استعمار کے مکمل تسلط پر ختم ہوئی۔

الغرض قرآن ہی وہ حقیقی منشور ہے جو ہمیں ہماری خدائی ھدایت کی اصل شکل و صورت پھر سے مہیا کر سکتا ہے۔ اس کی صحیح تفہیم ہی ہمارے اندر پھر وہی روح پھونک سکتی ہے جس نے ایکبار قبل ازیں بھی عرب کی ایک پسماندہ قوم کو اعلیٰ ترین کردار کا حامل بنا کر تمام تر رفعتوں سے ہمکنار کیا تھا۔

لیکن اگلا سوال یہ کیا گیا کہ قرآن فہمی کا صحیح طریقہ کیا ہونا چاہیئے۔ تو اس سلسلے میں قرآنی سکالرز چند متعین اصول بیان فرماتے ہیں۔

۱] قرآن اپنی تفسیر خود کرتا ہے۔ کوئی اور ہستی یا تحریر اتنا بلند پایہ درجہ رکھتی ہی نہیں کہ وہ اس الٰہی کلام کی تفسیر کے قابل ہونے کا دعویِ کر سکے۔ پس قرآن کو قرآن سے ہی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

۲] تصریف الایات کا اصول۔ جس کی رو سے ایک ہی موضوع سے متعلق آیات کو مختلف مواقع پر پھیر پھیر کر لایا گیا ہے۔ موضوع متعلقہ سے جڑی تمام آیات کو ایک جگہ جمع کیا جانا چاہیئے اور پھر اس موضوع کو ان تمام آیات کی مجموعی تفہیم کے پیش نظر ہی تعبیر دینا چاہیئے۔ اس ضمن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

انظر کیف نصرف الآیات لعلھم یفقھون [۶/۶۵]

انظر کیف نصرف الآیات ثم ھم یصدفون [۶/۴۶]

و لقد صرفنا فی ھذا القرآن للناس من کل مثل [۵۴/۱۸]

و لقد صرفنا فی ھذا القرآن لیذکروا [۴۱/۱۷]

۳] اسی تصریف کے ذریعے تفہیم کا دوسرا بڑا دروازہ بھی کھلتا ہے جسے تقابل ضدین کا اصول کہا گیا ہے۔ مثلاً تصریف کے ذریعے ایسی آیات بھی سامنے آجاتی ہیں جن میں کوئی بھی اصطلاح تقابل ضدین کی صورت میں اپنے حقیقی معنی قطعی طور پر خود واضح کر دیتی ہے۔ مثلاً:

فلا صدق و لا صلی، و لکن کذب و تولی [۷۵/۳۱۲]

یعنی نہ ہی سچ کر دکھایا اور نہ ہی پیچھے پیچھے آیا[پیروی کی] بلکہ جھٹلایا اور منہ پھیر کر چلا گیا

یہاں صلوۃ کے معنی پیروی اور تصدیق کے معنی سچ کر دکھانا کو ان کے مقابل معنی والے الفاظ " تولی " اور " کذب " سے اسطرح ثابت کیا گیا کہ ان معانی سے انکار ممکن ہی نہیں رہتا۔

۴] قرآن کا بلند پایہ ادبی اسلوب۔ ہر بلند پایہ لٹریچر امثلہ، محاورات، مجازی الفاظ و اصطلاحات اور تشبیہات و استعارات سے لیس ہوتا ہے۔ یہی اس لٹریچر کی خوبی اور

خوبصورتی ہوتی ہے۔ اور اس بلند و بالا اسلوب کا تقاضہ ہوتا ہے کہ اسے اسی اسلوب بیان کی رعایت سے ترجمہ و تشریح کیا جائے۔ لیکن عموماً دیکھا گیا ہے کہ تمام روایتی ترجمے اور تفاسیر میں ہر گز اس اسلوب کو اہمیت نہیں دی گئی بلکہ گھٹیا، عمومی اور لفظی ترجمے کے انداز کو اختیار کیا گیا ہے جس کے سبب قرآن کی تفہیم اپنی اصل سے بہت دور جا چکی ہے۔ اور قرآن کا اصل منشور ایک دیومالائی داستان بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ستم یہ ہے کہ بنو امیہ کے دور سے آج تک اسی دیومالائی، غیر عقلی تفسیر و ترجمہ کو دوام دیے رکھنے کی کوششیں جاری و ساری ہیں۔ اکا دکا کوئی دانشور و محقق اگر مندرجہ بالا اصول و ضوابط کو مشعل راہ بناتے ہوئے، دریافت و تصحیح کی مہم پر نکلتا ہے تو قرآن کے معانی مروجہ تفاسیر و تراجم کے مقابلے میں حیرت انگیز طور پر متضاد و متخالف ثابت ہوتے ہیں اور قرآن امت مسلمہ میں جاری و ساری تمام رسومات و تصورات کو منسوخ کرتا، انسانی حقوق و فرائض اور مساوات و اصلاحات کی ایک نئی شاندار دنیا ہمارے سامنے کھولتا نظر آتا ہے۔ لیکن پھر نام نہاد علماء کا انبوہ کثیر جو فرسودہ غیر عقلی روایتوں پر سختی سے عمل درآمد کروانے کے لئے ہی پیدا کیا گیا تھا، ایسی کسی بھی کوشش کو ملیامیٹ کرنے پر تل جاتا ہے۔ قبل ازیں تو صرف فتاویِ سے کام لیا جاتا تھا۔ آجکل امن و امان کی افسوسناک صورت حال میں قانون بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے اور تشدد و خونریزی کا راستہ اپنا لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام جس کا معنی ہی سلامتی اور امن ہے، ایسے تشدد کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔ اس لئے ان علماء کرام کو بمشکل ہی اسلام یا قرآن کا علمبردار کہا جا سکتا ہے۔ اقبال کی نگاہ بصیرت کا تجزیہ پیش خدمت ہے:

مکتب و ملا و اسرار کتاب — کور ما در زاد و نور آفتاب
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
دین کافر فکر و تدبیر جہاد — دین ملافی سبیل اللہ فساد
یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے — گلیم بوذر، و دلق اویس و چادر زہرا
مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی — اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

اس احقر کے ناچیز خیال میں اگر درس قرآن کے ضمن میں درج بالا چار اصول ہی مد نظر رکھ لیے جائیں تو قرآن کا نہ صرف حق ادا ہو گا بلکہ ایک ایسی تفہیم وجود میں آئیگی جو انقلابی تصورات کی حامل ہو گی اور قلب و نظر کو منور کرنے کا سبب ہو گی۔ جاہلانہ اوہام وعقائد اور فرسودہ بے نتیجہ رسومات پرستش کو ختم کرنے کا باعث ہو گی۔ اور ترقی یافتہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی موجودہ دنیا میں وقت کے نئے نئے علمی انکشافات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر پسماندہ مسلم اقوام کے لئے ترقی اور بلندیوں کے سفر کی راہ کھول دے گی۔

کیونکہ عزیزم شیخ طیب معاویہ کی فرمائیش پوری کرنا ضروری تھا، اس لئے فی الحال وقت کی از حد کمی اور اپنی کوتاہ بینی کا احساس رکھتے ہوئے، جزئیات میں اترے بغیر، مختصر ابس اتنا ہی لکھ پایا ہوں۔ کوشش کی ہے کہ موضوع کی اصل روح بہر حال اجاگر کر دی جائے اور بیماری کی اصل جڑ کی تشخیص کر لی جائے۔ اقبال نے اسی ضمن میں فرمایا تھا:

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی — علاج اسکا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی
نہ اٹھا کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے — وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

آللہ جل شانہ آپ سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

آخر میں ایک نصیحت آموز پیغام بھی:

آباء کے فسانوں کا تجھے اب بھی ھے سرسام

مبروص تیرا ذہن، تیری عقل زبوں گام

جھولی میں تری آج بھی اے بستہء ایام

سیلے ہوئے اقوال ھیں، چکٹے ھوئے اوہام

اے کشتہء اجداد، پئے نقد و نظر جاگ

اے نوع بشر جاگ اے نوع بشر جاگ

تو جنس تعصب کا خریدار ھے اب تک

دل وحدت اقوام سے بے زار ھے اب تک

تو مشرک و خونخوار و سیہ کار ھے اب تک

انساں کے اے دیدہء توحید نگر جاگ

اے نوع بشر جاگ۔۔۔۔